

تفہیم القرآن

الصفات

(۳)

اور ہم نے موسیٰ و ہارون پر احسان کیا، اُن کو اور ان کی قوم کو کرب عظیم سے نجات دی، انہیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے، ان کو نہایت واضح کتاب عطا کی، انہیں راہِ راست دکھائی، اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔ اور ایسا بھی یقیناً مُرسَلین میں نشے تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم

۶۹ یعنی اس شدید مصیبت سے جس میں وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں مبتلا تھے۔

نحہ حضرت ایسا علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اُن کا ذکر قرآن مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام اور دوسرا سورہ النعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانہ کے محققین ان کا زمانہ ۵۵۰ اور ۵۵۰ ق م کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جتھاد کے رہنے والے تھے (قدیم زمانہ میں جتھاد اس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یرموک کے جنوب میں واقع ہے)۔ بائبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تیشبی (ELIJAH THE TISHBITE) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رَحْبِیَام (REHOBAM) کی نااہلی کے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حصہ جو بیت المقدس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آل داؤد کے قبضے میں رہا، اور دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا اس میں ایک مستقل ریاست

اسرائیل کے نام سے قائم ہو گئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ مملکت دونوں ہی ریاستوں کے دیگر گوں تھے، لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت، بگاڑ کی راہ پر چل پڑی تھی جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی، ظلم و ستم اور فسق و فجور کا زور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اخعی اب (A H A B) نے محسدا (موجودہ لبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبل (J E Z E B E L) سے شادی کر لی تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں اگر اخعی اب خود بھی مشرک ہو گیا، اس نے سامریہ میں بعل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا، خدا سے واحد کی پرستش کے بجائے بعل کی پرستش رائج کرنے کی ہر لوپ کو شش کی اور اسرائیل کے شہروں میں علانیہ بعل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

یہی نہ تھا جب حضرت ایسا علیہ السلام یکایک منظر عام پر نمودار ہوئے اور انہوں نے عباد سے اگر اخعی اب کو لڑکس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برے گا، حتیٰ کہ اوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حوت بخت صیح ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال تک بارش بالکل بند رہی تاخیر کا اخعی اب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت ایسا کو بلائیں کرا کے بلوایا۔ انہوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ رب العالین اور بعل کا فرق اچھی طرح بتا دیں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے حکم دیا کہ ایک مجمع عام میں بعل کے پوجاری بھی آکر اپنے معبود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ رب العالین کے نام پر قربانی کروں گا۔ دونوں میں سے جس کی قربانی بھی انسان کے ہاتھوں سے آگ لگاٹے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہو جائے اس کے معبود کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ اخعی اب نے یہ بات قبول کر لی۔ چنانچہ کوہ کرمل (C A R M E L) پر بعل کے ساڑھے آٹھ سو پوجاری جمع ہوئے اور اسرائیلیوں کے مجمع عام میں ان کا اور حضرت ایسا علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں بعل پرستوں نے شکست کھائی اور حضرت ایسا نے سب کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ بعل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ایسا نے اسی مجمع عام میں بعل کے پوجاریوں کو قتل کرا دیا اور پھر بارش کے لیے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی یہاں تک کہ پورا ملک اسرائیل سیراب ہو گیا۔

لیکن ان معجزات کو دیکھ کر بھی زن مریداخی اب اپنی بت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا اس کی بیوی ایزبل حضرت الیاس کی دشمن ہو گئی اور اس نے قسم کھالی کہ جس طرح بعل کے پوجاری قتل کیے گئے ہیں اسی طرح الیاس علیہ السلام بھی قتل کیے جائیں گے۔ ان حالات میں حضرت الیاس کو ملک چھوڑنا پڑا اور چند سال تک وہ کوہ سینا کے دامن میں پناہ گزین رہے۔ اس موقع پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی اسے بائبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے :

”بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں

کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔“

(۱۔ سلاطین ۱۹ : ۱۰)

اُسی زمانہ میں بیت المقدس کی یہودی ریاست کے فرمانروا یہورام (JEHORAM) نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب کی بیٹی سے شادی کر لی اور اس مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاس نے یہاں بھی غرضیت نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ بائبل میں نقل ہوئے ہیں :

”خداوند تیرے باپ داؤد کا خدایوں فرمانا ہے : اس لیے کہ تو نہ اپنے باپ یہو سبط

کی راہوں پر اور نہ یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی

راہ پر چلا ہے اور یہوداہ اور یروشلم کے باشندوں کو زنا کار بنایا جیسا اخی اب کے خاندان

نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے قتل

بھی کیا، سو دیکھ خداوند تیرے لوگوں کو اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو

بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض سے سخت بیمار ہو جائے گا یہاں تک

کہ تیری انتڑیاں اس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی چلی جائیں گی (۲۔ تواریخ ۲۱ :

۱۲-۱۵)

اس خط میں حضرت الیاس نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ پہلے یہورام کی ریاست بیڑنی حملہ آوروں

لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اُس اللہ کو جو
کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو دشمن پکڑے گئے، پھر وہ خود انٹریوں کے مرض سے ہلاک ہوا
چند سال کے بعد حضرت الیاس پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انہوں نے انخی اب کو، اور اس کے
بعد اس کے بیٹے آخریاء کو راہ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان
میں گھر کر چکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخر کار حضرت کی بددعا سے انخی اب کا گھرانا ختم ہو گیا اور اس کے
بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھالیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائبل کے حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں: ۱۔ سلاطین باب

۱۷-۱۸-۱۹-۲۱-۲۲ سلاطین باب ۱-۲-۲۲ تواریخ باب ۲۱-

۱۔ بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوبہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدد
مقامات پر خود قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورہ بقرہ آیت ۲۲۸، سورہ نساء آیت ۱۲۷، سورہ
ہود آیت ۷۲، اور سورہ نور آیت ۳۱ میں لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الہ یا خداوند کے
معنی میں استعمال کرتی تھیں اور انہوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ خصوصیت
کے ساتھ لبنان کی فنیقی قوم (PHOENICIANS) کا سب سے بڑا دیوتا بعل تھا اور اس کی بیوی
عشتارات (ASHTORETH) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے
کہ آیا بعل سے مراد سورج ہے یا مشتری، اور عشتارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہر حال یہ بات تاریخی
طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لیڈر مضر تک پورے مشرق وسطیٰ میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خصوصاً لبنان
اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بڑی طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد
فلسطین اور شرق اردن میں آکر آباد ہوئے، اور توراۃ کے سخت اتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے
انہوں نے ان مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرتے شروع کر دیئے
تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اول حضرت
یوشع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا:

تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آبا و اجداد کا رب ہے؛ مگر انہوں نے اسے جھٹلادیا، سواب
یقیناً وہ منرا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں، بجز ان بندگان خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا
تھا۔ اور ایاس کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔ سلام ہے ایاس پر۔ ہم نیکی

”اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بعیم کی پرستش کرنے لگے۔۔۔ اور وہ

خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عشتاروت کی پرستش کرنے لگے“ (قضاۃ ۲: ۱۱-۱۳)

”سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حیتیوں اور اموریوں اور فیزیوں اور خوتیوں اور یوہوہوں

کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو

دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے“ (قضاۃ ۲: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان

کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس

حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک

جمع کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اُس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈے کو توڑا تھا

(قضاۃ ۶: ۲۵-۳۲)۔ اس صورت حال کو آخر کار حضرت سموئیل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور

سیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت

پرستی کو برباد کیا۔ لیکن حضرت سیمان کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھر اُور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی

ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہ گئی۔

۲؎ یعنی اس منزل سے صرف وہی لوگ منتہی ہونگے جنہوں نے حضرت ایاس کو نہ جھٹلایا اور جن کو اللہ نے

اُس قوم میں سے اپنی بندگی کے لیے چھانٹ لیا۔

۳؎ حضرت ایاس علیہ السلام کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جیسا کچھ ستایا اُس کی داستان اوپر

گزر چکی ہے، مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰ کے بعد کم ہی لوگوں کو انہوں نے

اُن سے بڑھ کر جلیل القدر مانا ہوگا۔ اُن کے ہاں مشہور ہو گیا کہ ایاس علیہ السلام ایک بگڑے میں آسمان پر زندہ

کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ واقعی وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

اٹھائیس گئے ہیں ۲ ساہین باب دوم، اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ چنانچہ بائبل کی کتاب ملاکی میں لکھا ہے:

”وکیجو، خداوند کے بزرگ، اور ہولناک دن کے آنے سے پہلے میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس

بھیجوں گا“ (۲: ۱۵)

حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی بعثت کے زمانہ میں یہودی بالعموم مین آنے والوں کے منتظر تھے ایک حضرت الیاس۔ دوسرے مسیح۔ تیسرے ”وہ نبی“ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب حضرت یحییٰ کی نبوت شروع ہوئی اور انہوں نے لوگوں کو اصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا کیا تم مسیح ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم ایلیاہ ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم وہ نبی ہو۔ انہوں نے کہا میں وہ بھی نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا اگر تم نہ مسیح ہو، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر تم بتاؤ کیوں دیتے ہو؟ (یوحنا: ۱۹-۲۶) پھر کچھ مدت بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا غفلہ ملینڈ ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید ایلیاہ نبی آگئے ہیں (مرقس: ۶: ۱۴-۱۵)۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں بھی یہ خیال پھیل ہوا تھا کہ ایلیاہ نبی آنے والے ہیں۔ مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ ”ایلیاہ تو آچکا، اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔“ اس سے حواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاس (متی: ۱۱: ۱۴ اور متی: ۱۰: ۱۳)

لکھنا اصل میں الفاظ میں سلام علیٰ الیاسین۔ اس کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیاس کا دوسرا نام ہے، جس طرح حضرت ابراہیم کا دوسرا نام ابراہام تھا۔ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ اہل عرب میں عبرانی اسماء کے مختلف تلفظ رائج تھے مثلاً میکال اور میکائیل اور میکائین ایک۔ یہ فرشتے کو کہا جاتا تھا۔ ایسا ہی معاملہ حضرت الیاس کے نام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک ہی پہاڑ کا نام طور سیناء بھی آیا ہے اور طور سینین بھی۔

اور لوط بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیلکے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی پھر باقی سب کو نہیں نہیں کر دیا۔ آج تم شب و روز ان کے اجر ۷۰ دینا پر سے گزرتے ہو۔ کیا تم کو عقل نہیں آتی؟

اور یقیناً یونس بھی رسولوں میں سے تھا۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا، پھر قعر اندازی میں شرمیک ہوا اور اس میں مات کھائی۔ آخر کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔ اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اسی

۷۵ اس سے مراد حضرت لوط کی بیوی ہے جو ہجرت کا حکم آنے پر اپنے شوہر و نادر کے ساتھ نہ گئی بلکہ اپنی قوم کے ساتھ رہی اور مبتلائے عذاب ہوئی۔

۷۶ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قریش کے تاجر شام و فلسطین کی طرف جاتے ہوئے شب و روز اس علاقے سے گزرتے تھے جہاں قوم لوط کی تباہ شدہ بستیاں واقع تھیں۔

۷۷ یہ تیسرا موقع ہے جہاں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورہ یونس اور سورہ انبیاء میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں و ملاحظہ ہو تفسیر القرآن جلد دوم، صفحہ ۳۱۲-۳۱۳۔ جلد سوم، صفحہ ۱۸۲-۱۸۳۔

۷۸ اصل میں لفظ آتق استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں صرف اُس وقت بولا جاتا ہے جبکہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے۔ اِلَا باق ھوب العبد من سیدہ۔ اِلَا باق کے معنی ہیں غلام کا اپنے آقا سے فرار ہو جانا۔ (لسان العرب)

۷۹ ان تقروں پر غور کرنے سے جو صورت واقعہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) حضرت یونس جس کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ اپنی گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی (OVERLOADED)

تھی۔

(۲) قعر اندازی کشتی میں ہوئی، اور غالباً اُس وقت ہوئی جب بحری سفر کے دوران میں یہ محسوس ہوا کہ

مچلی کے پیٹ میں رہتا۔ آخر کار ہم نے اسے بڑی ستقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا۔
بوجھ کی زیادتی کے سبب سے تمام مسافروں کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ لہذا قرعہ اس غرض کے لیے ڈالا گیا کہ جس
کا نام قرعہ میں نکلے اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

۳، قرعہ میں حضرت یونس ہی کا نام نکلا۔ وہ سمندر میں پھینک دیئے گئے اور ایک مچلی نے ان کو
نکل لیا۔

۴، اس ابتلا میں حضرت یونس اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ اپنے آقا یعنی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے
بغیر اپنے مقام ماموریت سے فرار ہو گئے تھے۔ اس معنی پر لفظ اَبَقَ بھی دلالت کرتا ہے جس کی تشریح اوپر
حاشیہ ۷، میں گزر چکی ہے۔ اور اسی معنی پر لفظ بَلِغَمٌ بھی دلالت کرتا ہے۔ بلغم ایسے قصور دار آدمی کو کہتے
ہیں جو اپنے قصور کی وجہ سے آپ ہی ملامت کا مستحق ہو گیا ہو، خواہ اسے ملامت کی جائے یا نہ کی جائے۔
قَدْ اَلَامَ الرَّجُلُ، اِذَا اتَى مَا يَلَامُ عَلَيْهِ مِنَ الْاَمْرِ وَانْ لَمْ يَكُنْ۔ ابن جریر،

۵، اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام
پیسے بی خدا سے غافل لوگوں میں سے نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو دائماً اللہ کی تسبیح کرتے والے ہیں
دوسرے یہ کہ جب وہ مچلی کے پیٹ میں پہنچے تو انہوں نے اللہ ہی کی طرف رجوع کیا اور اس کی تسبیح کی۔
سورہ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے قَدْ اَدٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ بُسِّحَ اَنفُكُ اِنِّیْ کُنْتُ
مِنَ الظَّالِمِیْنَ پس اُن تاریکیوں میں اُس نے پکارا ”نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات۔
بے شک میں قصور وار ہوں۔“

۶، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مچلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یونس قیامت تک
اس کے پیٹ میں زندہ رہتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اس مچلی کا پیٹ ہی حضرت یونس کی
قبر بنا رہتا۔ مشہور مفسر قتادہ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے ابن جریر۔

۷، یعنی جب حضرت یونس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور وہ ایک بندہ مومن و قانت کی طرح اس کی
تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچلی نے اُن کو ساحل پر اُگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا جس میں

اور اُس پر ایک بیلدار و رخت اُگا دیا۔ اس کے بعد ہم نے اُسے ایک لاکھ، یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا، وہ ایمان لاتے اور ہم نے ایک وقت خاص تک انہیں باقی رکھا۔

کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونس پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔
 ۳۳۵ اصل الفاظ ہیں شَجَرَةً مِّنْ يَّقِطِينَ یَقِطِیْن عَرَبِی زَبَان میں ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بیل کی شکل میں پھیلتا ہے جیسے کہ روز بروز، لکڑی وغیرہ۔ بہر حال وہاں کوئی ایسی بیل موجود نہ تھی۔
 طریقہ پر پیدا کر دی گئی تھی جس کے پتے حضرت یونس پر سایہ بھی کریں اور جس کے پھل ان کے لیے بیک وقت غذا کا کام بھی دیں اور پانی کا کام بھی۔

۳۳۶ ایک لاکھ یا اس سے زائد کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی تعداد میں شک تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی بستی کو دیکھنا تو یہی اندازہ کرتا کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہوگی، کم نہ ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ یہ وہی بستی تھی جس کو چھوڑ کر حضرت یونس بھاگے تھے۔ ان کے جانے کے بعد عذاب آتا دیکھ کر جو ایمان اُس بستی کے لوگ لے آئے تھے اس کی حیثیت صرف نوبہ کی تھی جسے قبول کر کے عذاب اُن پر سے مٹا دیا گیا تھا اب حضرت یونس دوبارہ ان کی طرف بھیجے گئے تاکہ وہ نبی پر ایمان لاکر باقاعدہ سلمان ہو جائیں۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے سورہ یونس، آیت ۹۸ نگاہ میں رہنی چاہیے

حضرت یونس کے اس قصے کے متعلق سورہ یونس اور سورہ انبیاء کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، اس لیے منہ سب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے مفسرین کے اقوال بھی نقل کر دیئے جائیں

مشہور مفسر قتادہ سورہ یونس، آیت ۹۸ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کوئی بستی ایسی نہیں گزری ہے جو کفر کر چکی ہو اور عذاب آجائے کے بعد ایمان لائی ہو اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس سے صرف قوم یونس مستثنیٰ ہے۔ انہوں نے جب اپنے نبی کو تلاش کیا اور نہ پایا، اور محسوس کیا کہ عذاب خراب آگیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں میں نوبہ ڈال دی (ابن کثیر، جلد ۴، ص ۴۳۳)

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی لکھتے ہیں: "اس قوم کا قصہ یہ ہے کہ یونس علیہ السلام موصل کے علاقے میں نینوی کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ کافر و مشرک لوگ تھے حضرت یونس نے ان کو اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان لانے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ انہوں نے انکار کیا اور جھٹلایا حضرت یونس نے ان کو خبر دی کہ تیسرے دن ان پر عذاب آجائے گا اور نصیرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو وہ بتی سے نکل گئے۔ پھر دن کے وقت جب عذاب اس قوم کے سروں پر پہنچ گیا... اور انہیں یقین ہو گیا کہ سب ہلاک ہو جائیں گے تو انہوں نے اپنے نبی کو تلاش کیا، مگر نہ پایا۔ آخر کار وہ سب اپنے بال بچوں اور جانوروں کو لیکر صحراء میں نکل آئے اور ایمان و توبہ کا اظہار کیا... پس اللہ نے ان پر رحم کیا اور ان کی دعا قبول کر لی" (روح المعانی، جلد ۱۱، ص ۱۷۰)

سورہ انبیاء کی آیت ۸۷ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ آلوسی لکھتے ہیں: "حضرت یونس کا اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل جانا ہجرت کا فعل تھا، مگر انہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔" (روح المعانی ج ۱، ص ۱۷۷)۔ پھر وہ حضرت یونس کی دعا کے فقرہ اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: "یعنی میں قصور وار تھا کہ انبیاء کے طریقہ کے خلاف، حکم ماننے سے پہلے، ہجرت کرنے میں جلدی کر بیٹھا۔ یہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف سے اپنے گناہ کا اعتراف اور توبہ کا اظہار تھا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس مصیبت کو دور فرما دے" (روح المعانی، ج ۱، ص ۱۷۸)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ماثیہ اس آیت پر یہ ہے کہ "وہ اپنی قوم پر جبکہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیئے اور قوم پر سے عذاب ٹل جانے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لیے ہمارے حکم کا انتظار نہ کیا۔" (بیان القرآن)

اسی آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی حاشیہ میں فرماتے ہیں: "قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصے میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکم الہی کا انتظار نہ کیا اور وہ وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا... اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ، اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بے شک میں نے جلدی کی کہ تیسرے حکم کا انتظار کیے بدون یسنى والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔"

پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو، کیا تمہارے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ تمہارے سورہ صافات کی آیات بالائی تشریح میں امام رازی لکھتے ہیں: ”حضرت یونس کا قصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس قوم کو جس نے انہیں جھٹلایا تھا، ہلاک کرنے کا وعدہ فرمایا، یہ سمجھے کہ یہ عذاب، لامحالہ نازل ہوتے والا ہے، اس لیے انہوں نے صبر نہ کیا اور قوم کو دعوت دینے کا کام چھوڑ کر نکل گئے۔ حالانکہ ان پر واجب تھا کہ دعوت کا کام برابر جاری رکھتے، کیونکہ اس امر کا امکان باقی تھا کہ اللہ ان لوگوں کو ہلاک نہ کرے“ (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۵۸)

علامہ آلوسی اخذ بقی الی القلک المکتھون پر لکھتے ہیں: ”ابق کے اصل معنی آقا سے فرار ہونے کے ہیں۔ چونکہ حضرت یونس اپنے رب کے اذن کے بغیر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے اس لیے اس لفظ کا اطلاق ان پر درست ہوا۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: ”جب تیسرا دن ہوا تو حضرت یونس اللہ تعالیٰ کی ابازت کے بغیر نکل گئے۔ اب جو ان کی قوم نے ان کو نہ پایا تو وہ اپنے گھر سے اور چھوٹے اور چاروں طرف سب کو لے کر نکلے، اور نزول عذاب ان سے قریب تھا، پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور زاری کی اور معافی مانگی اور اللہ نے انہیں معاف کر دیا“ (روح المعانی، جلد ۲۳، ص ۱۳۰)

مولانا شبیر احمد صاحب دھوملیم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکم الہی کا انتظار کیے بغیر جتنی سے نکل پڑے اور خدا کے دن کی تعیین کر دی“

پھر سورہ انفک کی آیت فاصبر لیٰ فی الامر ذلک لا تشکک بکھایہ۔ اب الحوت پر مولانا شبیر احمد صاحب دھوملیم یہ سہے ”یعنی پھلی کے پیٹ میں بندنے والے پیغمبر حضرت یونس علیہ السلام کی طرے مکتدین کے معاملہ میں تھا۔ دلی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیجیے۔“ اور اسی آیت کے فقرہ وھو مکتظوم پر حاشیہ تحریر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں: ”یعنی قوم کی طرف سے غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ جنہا کوشتابی عذاب کی دعا، بلکہ پیشین گوئی کر بیٹھے۔“

۵۵۶ یہاں سے ایک دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ پہلا مضمون آیت نمبر اسے شروع ہوا تھا جس میں کفار مکہ کے سامنے یہ سوال رکھا گیا تھا ”ان سے پوچھو، کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا ان

رکے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے! کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو، دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے حکم لگا رہے ہو۔ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا۔ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صحت سند ہے، تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔

چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں: اب انہی کے سامنے یہ دوسرا سوال پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا منشا کفار کو ان کی اس گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ وہ زندگی بعد موت اور جزا و سزا کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب، یہ دوسرا سوال ان کی اس جہالت پر متنبہ کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے تھے اور قیاسی گھوڑے دوڑا کر حس کا چلہ پھرتے تھے اللہ سے رشتہ جھڑ دیتے تھے۔

۱۷ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، جہنہ، بنی سلمہ، خزاعہ، بنی یلیع اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو النساء آیت ۱۱۷۔ النحل آیات ۵۷-۵۸۔ بنی اسرائیل آیت ۶۰۔ الزخرف آیات ۱۶ تا ۱۹۔ النجم آیات ۱ تا ۲۷۔

۱۸ یعنی ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ایسی بات مثلاً ہر کی بنا پر کہی جاسکتی ہے، یا پھر اس طرح کا دعویٰ کرنے والے کے پاس کوئی کتاب الہی ہونی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہو کہ ملائکہ میری بیٹیاں ہیں۔ اب اگر اس عقیدے کے قائلین نہ مثلاً ہرے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، اور نہ کوئی کتاب الہی ایسی رکھتے ہیں جس میں یہ بات کہی گئی ہو، تو اس سے بڑی جہالت و حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ محض ہوائی باتوں پر ایک دینی عقیدہ قائم کر لیا جائے اور خداوند عالم کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو صریحاً مضحکہ انگیز ہیں۔